بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جمہوریت اور آمریت پر یوں تو اس دور میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر ان میں مواد اور خیالات کے لحاظ سے زیادہ جاندار اور وقیع وہ کتب ہیں جو دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد شائع ہوئیں۔ گزشتہ صدی کی آخری دہائی سے لے کر اس صدی کی پہلی دہائی تک اس موضوع پر جن لوگوں نے بھی اظہارِ خیال کیا اُن کا اندازِ بیان اکثر و بیشتر فلسفیانہ تھا اور اُن کے مباحث کی نوعیت کافی حد تک نظری تھی مگر دوسری جنگِ عظیم کے بادل چھٹ جانے کے بعد جب فضا صاف ہوئی اور جذبات کے شعلے ٹھنڈے ہوئے تو پھر اہلِ فکر اور سنجیدہ اور حساس طبقوں نے جنگ کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں کے روح فرسا مناظر کو دیکھتے ہوئے جس زاویہ نگاہ سے آمریت اور جمہوریت کا جائزہ لیا، اس میں ان دونوں نظاموں کے عملی مظاہر اور اُن سے پیدا ہونے والے نتائج پر اظہارِ خیال کیا گیا۔ پھر اس ضمن میں بعض مفکرین نے ان نظاموں کے عناصرِ ترکیبی کا تجزیہ کر کے بتایا کہ یہ دونوں نظام جن عناصر سے عبارت ہیں وہ کسی قوم اور ملک کے اندر کس قسم کے حالات کو لازمی طور پر جنم دیتے ہیں۔

اس موضوع پر جتنی کتابیں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں سٹیفن کنگ ہال کی کتاب تین آمر (THREE DICTATORS) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس میں مصنف نے تین بڑے آمروں مسولینی، ہٹلر اور سٹالن کے عروج و زوال کی داستان کو اس انداز سے قلمبند کیا ہے جس سے اسباب اور نتائج میں ایک معنوی ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ کنگ ہال نے سب سے پہلے ان حالات کی نشاندہی کی ہے جو آمریت کے فروغ اور تسلط کے لیے سازگار ہوتے ہیں۔ پھر آمر اس تسلط کے بقا کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اُن پر اُس نے بڑی فکر انگیز بحث کی ہے اور آخر میں

اس حسرتناک انجام کا تذکرہ کیا ہے جس سے خود آمر دوچار ہوتا ہے اور قوم کو دوچار کرتا ہے۔ فاضل مصنف نے اپنی اس تصنیف میں جن خیالات کا تذکرہ کیا ہے اُن سے پوری طرح تو اتفاق نہیں کیا جا سکتا مگر اس امر سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے آمریت کے آغاز، عروج اور انجام کا جس دیدہ وری سے جائزہ لیا ہے وہ بڑا قابلِ قدر ہے اور اپنے اندر غور و فکر کے کئی ایک پہلو رکھتا ہے۔

آمریت کے آغاز کے بارے میں مصنف کی رائے یہ ہے کہ اس کا درخت نہ تو کسی زرخیز زمین میں جڑ پکڑتا ہے اور نہ زرخیز زمین اس کے برگ و بار لانے میں اس کی کسی اعتبار سے مددگار ثابت ہوتی ہے۔ آمریت کو صرف اُس قوم اور اُس ملک میں کچھ مدت تک سر اٹھانے اور اپنا تسلّط قائم کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے جو فکر و نظر کے اعتبار سے بنجر اور تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے سراسر ویرانہ ہو یا اگر یہ بات نہ ہو تو قوم پریشان فکری اور پریشان نظری کی شدید شکار ہو اور اس میں اس سے نجات حاصل کرنے کی کوئی ہمت اور ارادہ تو باقی نہ ہو البتہ یہ خواہش ضرور ہو کہ کوئی "مردے از غیب" آکر اس کی الجھنوں کو دور اور اُس کے دکھوں کا مداوا کرے۔ مگر اس سلسلے میں خود اسے کچھ نہ کرنا پڑے۔ کوئی شعبدہ باز شعبدہ بازی سے اس کے سارے مسائل حل کر دے۔

اگر کوئی قوم فی الحقیقت فکری اور نظریاتی اعتبار سے بانجھ ہے تو اس میں آمریت کے پنپنے کے بڑے روشن امکانات ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی طالع آزما ناموافق حالات میں آمریت کو کسی قوم پر مسلط کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ سب سے پہلے قوم کو بانجھ بناتا ہے یا اگر جلد از جلد بانجھ بنانے کی کوئی صورت نہیں پاتا تو ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے جن میں زندگی اُس کے لیے سراپا عذاب بن کر رہ جاتی ہے اور پھر بڑی ہنرمندی اور چابکدستی کے ساتھ اس کے ذہن کو اس بات کی طرف منتقل کرتا ہے کہ جب تک کسی مضبوط شخصیت کے ہاتھ عنانِ اقتدار نہیں آتی اس وقت تک اصلاحِ حال کی کوئی صورت ممکن نہیں ہو سکتی اور جس "مضبوط شخصیت" کا نقش بڑی عیاری کے ساتھ ابھار ابھار کر سامنے لایا جاتا ہے وہ اس مہم جو آمر کی اپنی ذات ہی ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں فاضل مصنف کی تصریحات قابلِ غور ہیں:

"سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ آمریت کا آغاز بسا اوقات بظاہر بڑے معصوم اور معقول انداز سے ہوتا ہے۔ قوم پر عرصۂ حیات تنگ ہونے کی وجہ سے اس کا ذہن اس نہج پر سوچتا ہے: ہمیں اس وقت ایک مضبوط حکومت کی ضرورت ہے تاکہ وہ ملک میں بڑھتی ہوئی بدامنی کو دور کر کے ملک میں امن و امان قائم کرے۔ تختِ اقتدار پر متمکن ہونے والا آمر اور اس کے ساتھی عام طور پر اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں: معاملات کو ہم پر چھوڑ دو ہم انہیں خود درست کر لیں گے مگر اس کام کو سرانجام دینے کے لیے ہمیں اُن آزادیوں پر مجبوراً کچھ پابندیاں عائد کرنی ہوں گی جن سے افراد نے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کو مصائب میں گرفتار کر دیا ہے۔ مثلاً ہم اصلاحِ احوال کے لیے مزدوروں سے ہڑتال کے حق کو سلب کرنے پر مجبور ہیں اور اسی طرح ہم اخبارات اور ریڈیو کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ حکومت کو مسلسل ہدفِ تنقید بناتے رہیں۔"

جب آمریت کا فروغ کسی قوم کے بانجھ ہونے سے مشروط ہے تو ظاہر بات ہے کہ اسے آگے بڑھنے کے مواقع صرف اُن بستیوں اور معاشروں ہی میں حاصل ہو سکتے ہیں جو نہ صرف افکار و نظریات کے لحاظ سے تہی دست ہوں بلکہ اجڑے ہوئے دیاروں کا بھیانک نقشہ پیش کرتے ہوں۔ اس کی تین صورتیں ہی ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ قوم فی الحقیقت فکر و نظر کی ساری صلاحیتوں سے یکسر عاری ہو یا اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے عاری ہو چکی ہو۔ دوسرے وہ حقیقت میں عاری تو نہ ہو مگر اسے ایسی الجھنوں میں پھنسا دیا گیا ہو کہ وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اُس کے اندر ان سے نجات حاصل کرنے کی قوت باقی نہیں رہی۔ کوئی زبردست ہاتھ ہی اُسے کھینچ کر ان سے باہر نکال سکتا ہے۔ تیسرے قوم کے اندر پائی جانے والی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اسے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت ساری تعمیری صلاحیتوں سے محروم کر دیا جائے اور ذہنی اور عملی لحاظ سے اس حد تک مفلوج بنا دیا جائے کہ وہ آمریت کے سہارے کے بغیر چلنا تو درکنار کھڑے ہونے کی بھی طاقت نہ رکھتی ہو اور اس بنا پر وہ اس سہارے کی ہمیشہ محتاج رہے۔

آمریت کے لیے ان تین سازگار صورتوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان تینوں میں کوئی ایک صورت بھی تعمیری نوعیت کی نہیں بلکہ مزاج اور طریقِ کار کے لحاظ سے یہ تینوں منفی اور تخریبی صورتیں ہیں جن سے فائدہ اٹھا کر اگرچہ آمر کسی قوم کی گردن پر مُسلّط ہو جاتا ہے مگر اُسے تباہی کے مہیب غاروں کی طرف دھکیل دیتا ہے۔

آپ ان تینوں صورتوں پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ کیا قوم کا کوئی حقیقی بہی خواہ ان میں سے کسی ایک سے بھی فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ کسی قوم کا فکری و نظری اعتبار سے بانجھ ہونا یا سیاسی شعور سے عاری ہونا قوم کے سچے خیر خواہوں کے لیے تو ہمیشہ سخت پریشانی کا موجب ہوتا ہے کیونکہ کسی قوم کے اندر ان عوارض کی موجودگی اس کی زندگی کے لیے شدید خطرے کا باعث ہوتی ہے۔ اس لیے قوم کا ہر مخلص غمگسار اسے اس مرض سے جلد از جلد نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے نہ کہ وہ اس مرض کو برقرار رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کا التزام کرے۔ جس طرح کسی بچے کا حقیقی باپ ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کا بچہ مفلوج ہو یا اس کے جسم پر کچھ کے لگا کر اسے بیکار کر دیا جائے یا اس کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو نشوونما پانے کا موقع نہ ملے اور وہ فکری لحاظ سے ہمیشہ عہدِ طفولیت ہی میں رہے، بالکل اسی طرح قوم کا کوئی حقیقی خیر خواہ اس بات کو ایک ثانیہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ قوم مفلوج ہو یا اس کے اندر نیک و بد کی تمیز ختم ہو جائے یا اس کا شعور اس حد تک معطل ہو کہ اسے اپنے حقوق و فرائض کی کوئی پہچان نہ رہے۔ وہ جب قوم کے اندر ان علامات میں سے کوئی علامت بھی دیکھتا ہے تو سخت مضطرب ہو جاتا ہے اور انہیں دور کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر دیتا ہے۔ قوم کو اذیت پہنچانے، اُسے ذہنی لحاظ سے بیکار بنانے اور اسے بے بس بنا کر اُس سے بیگار لینے کا کام قوم کے ہمدرد نہیں کرتے بلکہ قوم کے "خرکار" ہی کرتے ہیں جن کا فائدہ اسی میں ہوتا ہے کہ عوام کے احساسات یکسر مردہ ہو جائیں اور وہ حیوانوں کی طرح آمروں کے تابع رہ کر زندگی بسر کرنا اپنا مقدر سمجھ لیں۔

کسی قوم کا فکر و احساس کے لحاظ سے بانجھ ہونا بھی اگرچہ سخت تشویش ناک ہے مگر اس سے کہیں زیادہ ہولناک یہ بات ہے کہ اسے بانجھ بنانے کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ اگر جسم کا کوئی حصہ مفلوج ہو تو اسے درست کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن جب جسم صحت مند ہو تو اُسے مفلوج بنانے کے لیے جو

اذیت دینی پڑتی ہے اُس کے تصوّر سے روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اس شرمناک اور انسانیت سوز کام سے وہ شخص خدا کی پناہ مانگتا ہے جو اپنے پہلو میں دل رکھتا ہے۔ اس قسم کے گھناؤنے فعل تو وہ لوگ کرتے ہیں جن کی انسانیت بالکل مرچکی ہو اور جو بے بس لوگوں اور خصوصاً ناتواں بچوں کے اعضاء کاٹ کر یا موڑ توڑ کر اُنہیں دکھ درد کی تصویر بنا دیتے ہیں جو ایک طرف تو ان کے ہاتھ میں بے بس ہوتے ہیں اور دوسری طرف دیکھنے والے کے جذبۂ ترحم کو بیدار کر کے اپنے اُن ظالم مالکوں کے لیے خیرات کی زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرتے ہیں۔

دنیا کا ہر آمر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی قوم کے ساتھ وہی وحشیانہ سلوک کرتا ہے جو ایک خرکار بیگار کیمپ میں مقید بچوں اور دوسرے انسانوں کے ساتھ کرتا ہے۔ آپ اگر اس سلوک کا ذرا دقتِ نظر سے مطالعہ کریں تو آپ اس میں چار نمایاں خصوصیات پائیں گے۔

(۱) خرکار کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس شخص کو اُس نے قید کر رکھا ہے اسے اپنے گھر بار، عزیز و اقارب سب بھلا دیے جائیں اور وہ یکسوئی کے ساتھ صرف اسی کی خدمت و چاکری میں مصروف ہو جائے۔ بالکل اسی طرح آمر کی بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس قوم پر وہ مسلّط ہے اسے اپنا ماضی، اپنی روایات، اپنا مقصدِ حیات الغرض ہر وہ شے جس سے اُس کے اندر اپنے الگ قومی وجود کا احساس بیدار ہو یکسر فراموش ہو جائے اور آمر اُسے اپنا نیا رکردہ فکری اور جذباتی ماحول فراہم کرے۔ ہٹلر نے جرمن قوم کو دنیا کی دوسری قوموں سے الگ کرنے بلکہ ان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات بھڑکانے کے لیے جو نئے نظریات اور نیا فلسفہ دیا اُس میں ماضی سے بغاوت اور انسانی بنیادی اقدار سے یکسر بے تعلقی کے واضح رجحانات دکھائی دیتے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک شخص قوم کو نوعِ بشری سے بالکل کاٹ کر ایک مصنوعی ماحول میں بسانے کا التزام کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے جرمن قوم میں سطحی قسم کی جذباتیت پیدا ہوئی جس نے اس کی فکری صلاحیتوں کو وقتی طور پر بالکل معطل کر کے رکھ دیا۔

(۲) خرکار کی دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ اس کے زیرِ اثر آ گئے ہیں اُنہیں کسی نہ کسی طرح یہ باور کرایا جائے کہ اُن کی بھلائی اب اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو صرف اس کے دامن سے وابستہ رکھیں کیونکہ اس کے بغیر اُن کے لیے کوئی دوسرا چارہ کار ہی نہیں۔ اول تو وہ اس کے چنگل سے اب

نکل ہی نہیں سکتے کیونکہ فرار کی سب راہیں بالکل مسدود ہو چکی ہیں۔ دوسرے اگر وہ کبھی یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو جس ماحول میں سے الگ کر کے انہیں یہاں لایا گیا ہے وہ اب اُن کے لیے بالکل اجنبی بن چکا ہے اور اس اجنبی ماحول میں اُن کی زندگی اجیرن ہو گی۔

قریب قریب یہی اندازِ فکر دنیا کے آمر اپنی قوم کے معاملے میں اختیار کرتے ہیں۔ وہ تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کے لیے خرکاروں کی طرح قوم کو سبز باغ دکھاتے ہیں اور عوام کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ انہیں ذرا عنانِ حکومت سنبھالنے تو دو پھر دیکھو ان کے مصائب کس طرح دور ہوتے ہیں اور اُن کی محرومیاں کس طرح ختم ہوتی ہیں اور ملک سے بھوک، افلاس، بیروزگاری، ناانصافی، بدامنی کا کس طرح قلع قمع ہوتا ہے مگر جب اقتدار کا تخت ان کے قبضے میں آجاتا ہے اور وہ ان خوش کن وعدوں کو جن کے ذریعے انہوں نے اقتدار حاصل کیا ہوتا ہے پورا کرنے میں سخت ناکام ہوتے ہیں تو پھر اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے مسندِ اقتدار چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے بلکہ اس پر مسلط رہنے کے لیے یہ طرزِ عمل اور طرزِ استدلال اختیار کرتے ہیں: "چلئے ہم مانتے ہیں کہ صاحبِ اقتدار شخصیت اپنے وعدوں کو پورا کرنے میں کافی حد تک ناکام رہی ہے مگر اُس کی ذات کے علاوہ اب ملک میں ہے کون جو ان وعدوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اور حوصلہ رکھتا ہو؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اسے ہٹا کر ملک کا نظم ونسق بالکل درہم برہم کر دیا جائے اور اس طرح دشمن کے ناپاک عزائم کی تکمیل میں ان کی مدد کی جائے" ملک کے اخبارات اور ابلاغ کے دوسرے ذرائع اس دلیل کا خوب پرچار کرتے ہیں اور قوم کے دل و دماغ میں اس خیال کو اس حد تک راسخ کر دیتے ہیں کہ وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اس کی زندگی بھلی یا بُری تنہا اُس کی ذات سے وابستہ ہے۔ اور اگر خدانخواستہ وہ اقتدار سے دامن کش ہو گئی تو قوم لازمی طور پر تباہ ہو جائے گی۔ آمریت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ بلند بانگ دعووں، مسحور کن نعروں، ناقابلِ عمل پروگراموں کے ذریعے کسی قوم پر مسلط ہوتی ہے اور پھر "ناگزیر برائی" کے فلسفے کی افیون سے اُسے بیکار بنا کر زیادہ سے زیادہ مدت تک برداشت کرنے کا خوگر بناتی ہے۔ آمریت کے عروج و زوال کی پوری داستان کو تین فقروں میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ اس کا آغاز جھوٹے نعروں سے ہوتا ہے۔ تشدد اس کی محافظت اور نگہبانی کرتا ہے۔ اور عوام کی بے حسی، دوں ہمتی اور بے بصیرتی اس کے عہد کو طوالت بخشتی ہے۔

(۳) پھر آمر خرکاروں کی طرح نہ صرف اپنے زیر تسلط انسانوں کے اندر خوف و ہراس کی مہیب فضا پیدا کرتے ہیں بلکہ ان کے اندر مختلف قسم کے مفادات اور ان مفادات کی بنیاد پر حنفہ بندیاں کر کے ایک دوسرے کے خلاف لڑاتے بھی رہتے ہیں تاکہ اُن کی قوت ضائع ہوتی رہے اور وہ کبھی بھی ظالم کے خلاف صف آرا نہ ہو سکیں۔ یہ مثل مشہور ہے کہ مشترک خطرہ کسی قوم کے مختلف عناصر کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے۔ آمر اس بات کو جانتے ہوئے اپنے گماشتوں کے ذریعے ایسے حالات پیدا کرتا ہے جن میں قوم کے مختلف طبقے شدید خطرات کے اندر بھی ایک دوسرے سے متحد نہ ہو سکیں۔ وہ ان کے درمیان منافرت کے بیج بوتا ہے اور جو لوگ بھی اس خدمت کے لیے تیار ہوں اُن کی ہر طرح مدد کرتا ہے۔ وہ کبھی قوم کی صلاحیتوں کو مجتمع نہیں ہونے دیتا بلکہ انہیں منتشر رکھنے کا باقاعدہ التزام کرتا ہے۔ ملک کے اندر جس طبقے میں بھی وہ کوئی جان محسوس کرتا ہے اُس پر تابڑ توڑ حملے کر کے اس کی قوت فنا کر دیتا ہے۔ اگر وہ یہ دیکھتا ہے کہ ملک کی انتظامیہ اس کے آمرانہ عزائم کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے تو وہ انتظامیہ کو مفلوج کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اُس کے جاندار اعضا کو یا تو بڑی بے دردی اور سنگدلی سے کاٹ کر الگ کر دیتا ہے یا انہیں بالکل معطل بنا دیتا ہے تاکہ وہ کسی مرحلے پر بھی اس کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکیں۔

انتظامیہ کے علاوہ دوسری بڑی طاقت جسے آمر اپنے سامنے بالکل بے بس بنا کر رکھتا ہے وہ فوج ہوتی ہے۔ فوج کے ساتھ اُس کا طرز عمل بڑا عجیب و غریب ہوتا ہے۔ وہ اس کی قوت و طاقت سے عوام پر اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اہتمام کرتا ہے کہ فوج اس کے ہاتھ میں بالکل بے دست و پا بن کر رہے اور وہ جس وقت جو کام بھی اس سے لینا چاہے بڑی آسانی سے لے سکے۔

انتظامیہ اور فوج کے علاوہ ملک میں ہر آن بڑھتی ہوئی مہنگائی، عدم تحفظ کا ہر لحہ بڑھتا ہوا شدید احساس، محض جینے کے لیے حکمران اور حکمران پارٹی کی نگاہِ کرم کی احتیاج یہ سب چیزیں آمریت کے بقا کے لیے نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ اگر عوام بھوک سے نڈھال نہ ہوں تو پھر وہ قومی مسائل کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں اور ان کا یہ طرز عمل آمریت کے ایوانوں میں تزلزل پیدا کرتا ہے، اگر اُن کے اندر عدم تحفظ کے احساس کے بجائے احساس تحفظ پیدا ہو اور انہیں یہ معلوم ہو کہ حکومت سے اختلاف رائے کے باوجود اُن کے جان و مال محفوظ ہیں تو پھر وہ حکومت کی پالیسیوں پر لب کشائی کی جسارت کرنے لگتے ہیں جس سے آمریت کے محل میں شگاف پڑنے کا خطرہ ہوتا ہے اور اگر عوام یہ محسوس کریں کہ اُن کی زندگی حکمرانوں کی چشم التفات کی (باقی صفحہ ۸۴ پر)